احمد ندیم قاسمی کی نظم میں مزاحمت

ڈاکٹر محمد افضل حمید*

Dr. Muhammad Afzal Hameed

Abstract:

"Ahmad Nadeem Qasimi is a representative of the generation of progressive poets who popularize Marxist thinking through their own poems. Progressive writers talk about collectiveness beyond the religious, color discipline, and even by romantic concepts. The poems of Ahmad Nadeem Qasimi reflect the young man's feeling that wants to see equal system in society for everyone. For this social equality, he insists on stopping society and prepares others for a revolution. Studying Nadeem's poems helps us to understand that how a farmer or a soldier or a Youngman having love-filled heart can sacrifice his abilities at homeland at all times."

احمد ندیم قاسمی کی ابتدائی نظموں میں دوسری جنگ عظیم کے معاصر حالات کی گہری چھاپ موجود ہے۔ "جلال و جمال" کی بیشتر نظموں میں دیہی معاشرت کی جھلکیاں اور عالمی جنگ پر ردِ عمل دکھائی دیتا ہے۔ "سپاہی مورچے میں"، "سپاہی کی واپسی" وغیرہ اس نوع کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ۱۹۳۹ء تک کی شاعری میں وہ تذبذب کا شکار ہیں۔ عالمی انتشار اور سامراجی تسلط کے خلاف ان کے دل میں لہر اٹھتی ہے مگر ۱۹۴۲ء تک ان کی سوچ مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس دور کی ایک نظم "کھیل" میں دہقانوں کی حالت زار پر اپنے خیالات کو یوں پیش کرتے ہیں:

دھرتی کا جو سینہ چیرے آخر منہ کی کھائے
زر کی خاطر خون بہائے لیکن خاک نہ پائے
جگ کی جھولی بھرنے والا اور دامن پھیلائے
ہرے بھرے کھیتوں کا آقا اور فاقوں سے مر جائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے(۱)

۱۹۴۲ء کی ایک نظم "نیا منصور" میں انسانی عظمت کے متعلق اپنا آدرش پیش کرتے ہیں۔ قاسمی اپنی اس دور کی شاعری میں اقبال اور جوش کے مماثل نظر آتے ہیں اور محکومی کا اصل

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

سبب اہلِ ہند کی انفعالیت دور بے عملی کو سمجھتے ہیں سامراجی قوتوں کے عزائم بلاشبہ مذموم ہیں مگر ہماری عیش کوئی بھی لائقِ تحسین نہیں ہے، فرماتے ہیں:

محکومی عذرِ لنگ نہیں
ہیں چنگ مگر آہنگ نہیں
گو ذوق کے میداں تنگ نہیں
سینوں میں شوقِ جنگ نہیں
کیا خشکی ہے کیا پانی ہے
سلطانی ہی سلطانی ہے
اس دورِ غلامی میں لیکن
انجام سفر حیرانی ہے(۲)

احمد ندیم قاسمی مزدور طبقے کی محنت کے بل پر محلوں میں مقیم اشرافیہ کو اس بغاوت سے ڈراتے ہیں جو مزدور کے خون میں ابال آنے کی صورت میں کبھی بھی رونما ہو سکتی ہے۔ ان کے خیال میں مزدور بے کس اور مجبور نہیں ہے مزدور طبقہ اپنی ٹھوکر سے سرمایہ داری کے ایوانوں کو مسمار کر سکتا ہے۔ وہ مزدور کی ترجمانی یوں کرتے ہیں:

سب کہتے ہیں ، معزور ہوں میں
مجبور ہوں میں ، مہجور ہوں میں
دُشنام ! کہ غم سے چُور ہوں میں
مزدور ہوں میں مزدور ہوں میں
ڈر ، میری انا کی آگ سے ڈر
منصور ہوں میں ، منصور ہوں میں(۳)

۱۹۴۳ء میں اقبال کی طرز میں ابلیس اور اُس کے خادم کے مابین مکالماتی نظم "معمار عالم" تحریر کرتے ہیں جس میں دہقان کے ساتھ روا رکھی جانے والی زیادتیوں کو ابلیس کی زبانی، بطرز حکمتِ عملی بیان کرتے ہیں، ابلیس کہتا ہے:

اُف یہ دہقان --- یہ ایوانِ جہاں کا معمار
جس کا وجدان ہے تعلیم نوی سے عادی

جس کی پرہول درانتی کے اٹھے دندانے
میرے احساس یہ کرتے ہیں شرارہ باری
اس کو افلاس کے نرغے میں چھپائے رکھو
اس کو تقدیر کا محکوم بنائے رکھو
کھیت پک جائیں تو دھتکار دو کتے کی طرح
اگلے موسم کے تقاضوں سے لبھائے رکھو
یہ نہ مانے تو فرنگی کا لہو گرماؤ
ورنہ خود اپنے جہنم میں بھسم ہو جاؤ(۴)

۱۹۴۴ء کی نظم ''افشائے راز'' فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کی یاد دلاتی ہے، فیض، ساحر اور ظہیر کی طرح ندیم بھی محبت کرتے ہیں مگر ایک وقت ایسا آتا ہے جب محبوب کو پس پشت ڈال کر وطن اور سماج کی محبت اورانسان دوستی کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ندیم اپنے محبوب کو محنت کشوں اور مزدوروں کے دکھوں کی طرف متوجہ کراتا ہے:

امتیازات کے ماتھے پہ یہ مزدور کا نام
ایک دھوکا ہے سیاست کے دبستانوں کا
فلسفہ خاک بسر ، شاعری کشکول بدست
کوئی پرساں نہیں فطرت کے نگہبانوں کا(۵)

پھر محبوب سے کہہ دیتا ہے کہ تیری زلفیں سنوارنے کی بجائے مجھے بلکتے ہوئے انسانوں کا ساتھ دینا ہے:

تیرے گیسو کو سنواروں کہ سنوں واویلا
علم و حکمت کے گرجتے ہوئے طوفانوں کا
مجھ کو اب تجھ سے بہت دُور لیے جاتا ہے
ایک انبوہ بلکتے ہوئے انسانوں کا
ان کو عرفان کے چمن زار میں پہنچانے دے
عشق کی منزلِ اوّل سے گزر آنے دے(۶)

جوں جوں آزادی کے لمحات قریب آتے گئے، ندیم کی نظموں میں جوش کی شدت بڑھتی گئی۔ ۱۹۴۶ء میں ان کی نظمیں انقلاب کا مژدہ سناتی ہیں۔ ''نئی بغاوت'' میں عناصر کے جمود کے ٹوٹنے کا خواب دیکھتے ہیں انسان کی حالتِ زار کا ادراک کرتے ہیں کہ شہنشاہوں کا رتبہ عوام الناس سے بلند ہو گیا ہے اور آدمیت کے شرف کو اوطان میں قید کر کے رکھا گیا ہے لیکن وہ وقت دور نہیں جب انسانیت دوبارہ سے اپنی معراج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ''سمندر پار کے فرشتہ ہائے رحمت سے'' میں وزارتی مشن کے معلمینِ سیاست کو خونی انقلاب کی تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نہ جانے کب سے یہ طفلانہ کھیل جاری ہے
تمہاری ''عقدہ کشائی'' ہماری محرومی
مذاق پر اُتر آئی ہے جب شہنشاہی
تو اپنے آپ کو پہچانتی ہے محکومی
موّرخوں سے کہو خون میں ڈبوئیں قلم
بدل چکا ہے ارادے میں اضطراب اپنا
خزاں رہے کہ بہار آئے ، ہرچہ بادا بادا
اب اک زقند کا ہے منتظر شباب اپنا(۷)

''عقیدے''، ''خون''، ''ناگزیر'' جیسی نظموں میں یہی پیغام دیتے ہیں کہ انقلابات کو ٹالنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جنوری ۱۹۴۷ء کی نظم ''رفتارِ زمانہ'' اس انقلاب کی نوید سناتی ہے جس کی راہ روکنا استعماری قوتوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ وقت ایسا عامل ہے جو بہت کچھ بدل سکتا ہے لیکن پورے عالم میں رونما ہونے والے انقلابات کا سلسلہ شاید وقت کا منہ زور ریلا بھی ٹال نہ سکے گا۔ قلبِ زمین پھٹ جائے گا اور لہو بھی بلبلا اٹھے گا لیکن زمانہ انقلاب سے امان نہ پائے گا۔ شاعر کو ایک ہی تدبیر سوجھتی ہے کہ آہن و سنگ و شرر برسائے جائیں اور استعماریت کے پیڑ پر تیشہ و تبر سے وار کیا جائے۔ لامحالہ اندھیروں کو نگلنے کے لیے نوعِ انسان کو میدانِ عمل میں نکلنا ہی ہو گا۔ شہنشاہیت کے سنہری غبار کو جمہور کی آندھیوں میں اڑ جائیں گے۔ کہتے ہیں:

یہ انقلاب بھی دیکھا کہ نو شگفتہ کلی
رمیدہ بو تو رہی اب رمیدہ رنگ بھی ہے
سنبھل سنبھل کے چلے آ رہے ہیں تیر انداز

شکار گاہ میں آہو بھی ہے پلنگ بھی ہے
فرنگ ہی نے بہایا لہو ضعیفوں کا
اب اس بہاؤ کے ریلے میں خود فرنگ بھی ہے
عجیب شان سے نکھرا ہے ایشیا کا شباب
ادھر ہے چنگ تو اُس ہاتھ میں خدنگ بھی ہے
فریب خوردۂ پیماں ہوں ، آدمِ نو ہوں
وہ امن جو ہوں جسے انتظار جنگ بھی ہے(۸)

اسی طرح تقسیم ہند کے موقع پر بے گناہ لوگوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی۔ سرحد کے دونوں پار لہو بہایا گیا۔ بہت سے معصوم لوگوں کو خون میں نہلا دیا گیا فیض نے صبح آزادی کو ''داغ داغ اُجالا'' کیا تھا۔ ظہیر نے اسے ''سحر کا خواب ہے، سحر نہیں'' کہہ کر رنج کا اظہار کیا تھا۔ تقسیمِ ہند کے وقت سرحد کے دونوں پار خون کی جو ندیاں بہائی گئیں وہ دانشوروں، مفکروں شاعروں اور انسان دوست طبقوں کے لیے بالکل غیر متوقع تھیں۔ خون ریزی، عصمت دری، بربریت اور حیوانیت نے انسانیت کو شرمسار کر دیا احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں کی طرح اپنی نظموں میں بھی ان دلسوز واقعات پر خوب آنسو بہائے ہیں۔ انھوں نے اپنے کرب کا اظہار یوں کیا:

مگر چراغ کی لَو سے لہو نکلنے لگا
کچھ ایسی تند تھی جلتے لہو کی جولانی
جہانِ خواب مراکروٹیں بدلنے لگا
جب آنکھ کھول کے آفاق پر نظر ڈالی
توشش جہت سے لہو اس طرح اُبلنے لگا
کہ تنکے بن کے بہے جا رہے تھے سیکڑوں جسم
سُلگتے خون میں اِک کارواں روانہ ہوا
کِسی کے پاس درانتی ، کسی کے ہاتھ میں ہل
کسی کی بانہوں میں معصومیت کے رکھوالے
لبوں پہ مم کے تقاضے ، گلے میں تیز کٹار(۹)

قیامِ پاکستان کے بعد ندیم نے انہی جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کو ملک پر قابض ہوتے دیکھا جن کے بل پر انگریزوں نے برصغیر کے عوام کو محکوم بنائے رکھا۔ قومی اور ملی تقاضوں کو فراموش کر کے جاگیر دار فرنگیوں کے سامنے سربسجود تو ہو گئے مگر اپنی قوم کے بلکتے اور سسکتے طبقوں کے لیے قہر بنے رہے۔ لیکن تابہ کے آخر عوام میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق وہ اپنے آقائوں کی بوٹیاں نوچ لینے کو تیار ہیں ''مہاراج ادھیراج'' ایک طنزیہ نظم ہے جس میں بین السطور کہا گیا ہے کہ اب بھی عوام کی روٹیوں پر حکمرانوں کے مصاحبین کا اختیار ہے:

حضور آپ شاید نہ مانیں مگر آدمیّت مشیّت سے ٹکرا چکی ہے
حضور آپ نے خونِ انساں سے اپنے شبستاں کی تاریکیاں دُور کی تھیں
حضور آپ نے روٹیاں چھین لی تھیں، حضور آپ نے عصمتیں چُور کی تھیں
حضور آج بُھو کی رعایا نے ایوانِ مرمر پہ یلغار کر دی، سُنا ہے
حضور آپ کی خفتہ بختی نے اِک قوم کی قوم بیدار کر دی، سنا ہے
حضور اب جھروکے سے پردہ اُٹھا کر غریبوں کی وحشت کا نظّارہ کیجیے
ارادوں کی شِدّت کا اندازہ کیجیے امنگوں کی عظمت کا نظّارہ کیجیے(۱۰)

انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جنرل سیکرٹری بننے کے بعد احمد ندیم قاسمی، پاکستان میں ظلم وجور استحصال، اور ریاستی جبر کے خلاف اسی رنگ میں آواز بلند کرتے رہے جو ترقی پسندوں کا خاصہ ہے۔ نظم ''آزادی کے بعد'' میں ملکی صورتِ حال کو تلخ حقیقتوں کو علامتی اسلوب میں یوں بیان کرتے ہیں:

کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے
جن کی حدّت سے تپ رہے ہیں چمن
بن رہے ہیں گلے سڑے پتے
کتنی جامد حقیقتوں کے کفن
روٹیاں بوٹیوں سے تُلتی ہیں
عصمتوں کی سبھی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے

خون کا ذائقہ زبانوں پر[۱۱]

''رات بیکراں تو نہیں''، ''بہار آئے گی''، ''ارتقا''، '' جشن چراغاں''اور ''جبر واختیار'' اُسی بیم ورجا کی مظہر نظمیں ہیں جس کا شکار تمام ترقی پسند مصنّفین رہے ہیں۔ انسان صدیوں تک تہذیب اور تمدن کے سفر میں آگے بڑھا مگر استحصالی نظام کو شکست نہ دے پایا، مساوات اور عدم تشدد کے خواب تشنہ تعبیر رہے لیکن طلسمِ شب کا سحر ٹوٹے گا ضرور، بھیانک رات کا خاتمہ ہو گا، خون سے چراغ روشن کر کے اجالا کرنا پڑے تو کرنا ہو گا۔

نظم ''ایشیا'' چین میں چھ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کو دی جانے والی سزائے موت پر احتجاج ہے نظم ''درانتی'' میں درانتی استعارہ ہے رُوسی انقلاب کا، شاعر انقلاب کا ترانہ گاتا ہے:

ہم آفتاب ضمیر جہاں میں بوئیں گے
تو ایک روز عظیم انقلاب کاٹیں گے
کوئی بتلائے زمیں کے اجارہ داروں کو
بلا رہے ہیں جو گزری ہوئی بہاروں کو
کہ آج بھی تو اُسی شان بے نیازی سے
چمک رہے ہیں درانتی کے تیز دندانے
سنہری فصل تک اس کی چمک نہیں موقوف
کہ اب نظام کہن بھی اس کی زد میں ہے[۱۲]

دیگر مارکسی دانشوروں کی طرح ندیم بھی ادب اور سیاست کے باہمی ربط کے قائل ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا:

''ادب سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اگر ادب کو سیاست سے الگ کریں گے تو خلا والی شاعری کرنے لگیں گے۔ زندگی سے بالکل ہٹی ہوئی شاعری جو بے چاری گوشہ نشین ہو کر رہ جائے گی۔ اس لیے کہ سیاست تو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں ہے اور تو اور مذہب تک میں سیاست ہے۔ ہم جب بازار سے ایک پیسے کی سوئی خریدتے ہیں تو اس کے پیچھے بین الاقوامی سیاست کا ایک سمندر ہوتا ہے۔ ایک افسانے کی ہیروئن جب رو رہی ہے تو اس کے آنسوئوں کا اگر تجزیہ کریں تو ان

کے پیچھے ہمارا موجودہ نظام معاشرت، نظامِ معیشت، نظامِ تہذیب، یعنی اس کی پوری تاریخ ہو گی۔"(۱۳)

اپنی نظم "ادب وسیاست" میں ندیم اپنے نظریہ فن کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے بقول:

مرے پیشِ نظر رعنائی و امن و جوانی ہے
مرے مدِّ نظر انساں کا حسنِ جاودانی ہے
مشینوں کا دھواں اُجرت نہیں ہے جاں سپاری کی
مرصّع گالیاں قیمت نہیں خدمت گزاری کی
مجھے محنت کشوں کو دہر کا آقا بنانا ہے
مجھے تخلیق کو خالق کے پہلو میں بٹھانا ہے
مجھے ماؤں کو فقر و فاقہ سے آزاد کرنا ہے
مجھے بچوں کے چہروں میں گلابی رنگ بھرنا ہے
محبت چاہیے مجھ کو ، صباحت چاہیے مجھ کو
بغاوت ہے اگر یہ ، تو بغاوت چاہیے مجھ کو
یہی میرا ادب ہے ، اور یہی میری سیاست ہے
مرے جمہور ہی سے میری فن کاری عبارت ہے(۱۴)

ترقی پسند مصنّفین پر حکومتی جبر نازل ہوا تو ندیم بھی اس سے محفوظ نہ رہے، ایام اسیری میں ان کی نظمیں ان کی نظمیں ان کی عالی عزمی کی داستان سناتی ہیں "جرس کارواں" اور "آخری فیصلہ" بھی انسانیت دوستی اور تحریک وانقلاب کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ اسیری نے احمد ندیم قاسمی کو حالات کے ساتھ سمجھوتہ سکھایا۔ احمد ندیم قاسمی کے افکار میں واضح ارتقا آیا اور اشتراکی افکار کے پہلو بہ پہلو قومی وملی موضوعات بھی ان کی شاعری میں در آئے۔ ان کی حب الوطنی کا اصل امتحان ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ تھی۔ اس جنگ میں بیشتر ترقی پسند دانشور اس تذبذب کا شکار تھے کہ ملک خداداد کی حمایت کی جائے یا بھارت سے دوستی کا اظہار کیا جائے جس کی پشت پناہی روس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول:

"جس جرأت، حوصلہ مندی اور بے باکی سے احمد ندیم قاسمی نے چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں مضامین لکھے کسی اور ادیب ودانشور کے قلم سے نہیں نکلے

اور فی الحقیقت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس وقت اکثر ادیب ودانشور تذبذب
اور عدم فیصلہ کا شکار تھے لیکن قاسمی صاحب ہی کی آواز تھی جس نے سب کو
تذبذب کی دلدل سے نکال کر پاکستانی ہونا سکھایا تھا۔"(۱۵)

۱۹۷۱ء کے سانحہ پر ان کی نظمیں حب الوطنی کی ترجمان ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد انہوں نے پژمردہ قوم کو اپنی نظموں سے دوبارہ حوصلہ دینے کی کوشش کی اور قوم کی ڈھارس بندھانے کے لیے وطن دوستی کے جذبے کی حامل نظمیں کہیں۔ ان کی نظم "اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ" قنوطیت کو ترک کر کے وطن کی تعمیر کے جذبے کو ابھارنے کی کوشش کرتی ہے:

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے
جہاں سے پھول ٹوٹا تھا وہیں سے
کلی سی اک نمایاں ہو رہی ہے
جہاں بجلی گری تھی اب وہی شاخ
نئے پتے پہن کر تن گئی ہے(۱۶)

اہلِ وطن کی زبوں حالی پر انہوں نے صرف آنسو نہیں بہائے بلکہ لوگوں کو ملک کی تقدیر بدلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہونے پر آمادہ بھی کرتے رہے ہیں۔ "محنت کش"، "سرمایہ"، "نئی تعبیر"، "یہ رہبر" ایسی نظمیں ہیں جو ان کے میلان طبع کی ترجمان ہیں۔ آمر آتے رہے اور جاتے رہے۔ جمہوریت بھی ملک کے ایوانوں تک پہنچی مگر عوام کو کچھ بھی حاصل نہ ہو پایا۔ "بدستور" حالات کی تاریکی کو ظاہر کرتی ہے:

ذہن اب بھی چٹیل ہیں
روحیں اب بھی بنجر ہیں
جسم اب بھی ننگے ہیں
ہاتھ اب بھی خالی ہیں

اب بھی سبز فصلوں میں
زندگی کے رکھوالے

زرد زرد چہروں پر
خاک اوڑھے رہتے ہیں[۱۷]

آخر آخر میں ندیم کے لہجے کی تلخی کم ہوتی گئی، انقلابی افکار پر انہوں نے انسان دوستی اور حب الوطنی کے پردے ڈال دیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں:

> "ندیم نے خود کو ہر زمانے کی تازہ کروٹوں سے اخذ و اکتساب کی طرف مائل رکھا۔"[۱۸]

ندیم نے انسان دوستی سے بھی آگے بڑھ کر احترامِ انسانیت کے موضوعات کو بھی اختیار کیا۔ نبی پاک ﷺ سے ان کی محبت نے انھیں نعت گوئی کی طرف مائل کیا اور اسی لیے اشتراکی نظریات سے متاثر ہونے کے باوجود آپ اشتراکی ملا بننے کی بجائے ایک ایسے مزاحمتی شاعر کے طور پر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے جو دوسروں کے نظریات کو برداشت بھی کرتا ہے اور اپنے لہجے کو بھی تلخ ہونے سے بچاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد ندیم قاسمی، ندیم کی نظمیں (کلیات)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء ص ۱۰۴۹

۲۔ ایضاً، ص ۱۰۴۶ تا ۱۰۴۸

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۴۶ تا ۱۰۴۸

۴۔ ایضاً، ص ۹۶۳۔ ۹۶۲

۵۔ ایضاً، ص ۹۰۸

۶۔ ایضاً، ص ۹۰۹

۷۔ ایضاً، ص ۸۲۷۔ ۸۲۸

۸۔ ایضاً، ص ۷۹۷۔ ۷۶۹

۹۔ ایضاً، ص ۷۷۳۔ ۷۷۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۷۷۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۶۷۔ ۷۶۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۹۷۔ ۶۹۸

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، انٹرویو، مشمولہ: ادب اور ادبی مکالمے، ص ۱۶۰

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، ندیم کی نظمیں، ص ۶۸۸

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۷۳، ص ۲۰

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، ندیم کی نظمیں، ص ۳۳۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۸ء، ص ۳۷۸